ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

مقامِ محمد ﷺ

قرآنِ کریم کے آئینے میں

﴿۱﴾

قرآن کا آغاز سورۂ فاتحہ کے بعد البقرہ سے ہوتا ہے۔ سورۂ فاتحہ وہ دعا ہے جو ربِ کائنات نے مسلمان کو عطا کی اور قرآنِ حکیم جوابِ دعا ہے۔ سورۂ فاتحہ اللہ کی ربوبیت، اُس کے مستحق عبادت ہونے اور اُس سے ہدایت طلب کرنے کا اعلان ہے اور طلبِ ہدایت کے بعد ہمیں بتایا گیا کہ:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ O (۱)

اِس کتاب میں کوئی شبہ نہیں (اِس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں)
اور یہ متقیوں کے لئے ہدایت ہے۔

یہ سورۂ بقرہ کا شرف اور عظمت ہے کہ قرآنِ عظیم کے بارے میں یہ اعلان اُس کا نقطۂ آغاز ہے۔ حضرت ابنِ عربی نے سورۂ بقرہ کے بارے میں اپنے بزرگوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ!

اِس میں ایک ہزار امر اور ایک ہزار نہی اور ایک ہزار حکمتیں، ایک ہزار خبر اور قصص ہیں۔ (۲)

سورۂ بقرہ کا آغاز بعض بنیادی مباحث و مطالب (مسلمان کی تعریف اور خصائص، منافقوں کی علامات، قرآنِ حکیم کی صداقت) کے بعد بنی اسرائیل کے واقعات سے ہوا ہے

تاکہ محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانے والوں کو اپنا راستہ متعین کرنے اور اپنے رویے کے تعین میں آسانی ہو اور وہ اُن کی راہ پر نہ چلیں جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور جو گمراہ ہوئے۔ "**مغضوب علیھم**" وہ لوگ ہیں جو دین کے احکام و معارف سے دانستہ بغاوت کرتے تھے (یا آج بھی کرتے ہیں)۔ حق سے گریز، حیلہ جوئی، قتلِ انبیاء جن کی شناخت تھی۔ بنی اسرائیل کو اقوامِ عالم کا Fast Case کہنا مناسب ہوگا۔ قرآنِ حکیم نے کتاب کے ساتھ ساتھ تسلسلِ نبوت کے نکتے کو پیش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے انکار درحقیقت سلسلۂ وحی سے نفرت اور عداوت کا اظہار ہے۔ وہ جو ایک رسول کے منتظر تھے اُسی رسول کے عہد کو پانے اور اُسے دیکھنے کے لئے یثرب اور اُس کے نواح میں آکر آباد ہوئے تھے، سلسلۂ وحی کو دائرہ بنی اسحٰق سے نکلتے دیکھ کر اللہ، جبرئیل، ملائکہ اور رسل کے دشمن ہوگئے۔ وہ سرورِ کون و مکاں صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور صداقت کے دل سے قائل تھے مگر عناد و عداوت نے قبولِ حق سے روک دیا، اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان سے یوں خطاب فرمایا!

> قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا
> بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ
> وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ○ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ
> اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ج وَ مَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ○ (۳)

> اِن سے کہہ دیجئے کہ جو کوئی جبریلؑ سے عداوت رکھتا ہو، اُسے معلوم ہو کہ اُسی نے تمہارے قلب پر اللہ کے اِذن سے یہ (قرآن) نازل کیا ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور جو مومنوں کے لئے ہدایت اور بشارت ہے۔ (کہہ دو کہ) جو اللہ اور اُس کے ملائکہ اور اُس کے رسولوں اور جبریلؑ اور میکائیلؑ کے دشمن ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کافروں کا دشمن ہے اور ہم نے بیّن اور کھلی ہوئی آیات تمہاری طرف نازل کی ہیں اور اِن کا انکار فاسق ہی کرتے ہیں۔

یہ آیات کس طرح ہادیٔ نوعِ بشر، بشیر و نذیر صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبۂ عظیم کو

پیش کرتی ہیں۔ آپ کا دشمن اللہ کا دشمن ہے اور آپ کے قلبِ مبارک پر جو کتاب نازل ہوئی وہ تورات کی مصدِق ہے، پس جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی کرتے ہیں وہ اللہ کے دشمن اور انسانوں کے لئے سلسلۂ ہدایت کے مخالف اور دشمن ہیں۔

یہی نکتہ اگلی آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ اور قرآنِ حکیم کے اِن دشمنوں کی شعوری دشمنی اور مخالفت کے پردوں کو چاک کر دیا ہے۔ بنی اسرائیل نے وحیِ الٰہی سے منہ موڑ کر جادو ٹونے، عملیات اور گنڈوں کو اختیار کر لیا تھا اور یوں حق کی جگہ باطل اور ایمان کی جگہ کفر ان کا شعار ٹھہرا۔ حضرت محمدِ مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بنی اسرائیل کے لئے اُن کی بازیابی اور باز آفرینی کا آخری موقع تھا۔ جسے انہوں نے حق دشمنی کے تحت ضائع کر دیا۔

> وَلَمَّا جَآءَ هُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ كَاَنَّهُمْ لا يَعْلَمُونَ O (۴)
>
> اِن کا رویہ تو یہ تھا کہ ”اِن کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول اُس کتاب کی تصدیق کرتا ہوا آیا جو اِن کے پاس موجود تھی تو اِن کے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اِس طرح پسِ پشت ڈال دیا گویا کہ وہ کچھ نہیں جانتے“ (حالانکہ اُنہیں معلوم ہے کہ یہ کتاب اللہ ہے)۔

بنی اسرائیل کا یہ رویہ رسولوں کے ساتھ تھا، مگر یہاں پر تذکرہ عمومی ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت محمدِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بنی اسرائیل کے رویے کا احاطہ کرتا ہے کیونکہ اِس آیت کے بعد آیت نمبر ۱۰۴ سے سورۂ بقرہ کا نیا رکوع شروع ہوتا ہے جس میں بنی اسرائیل کے رویے اور مخالفت کے پس منظر میں ہمیں اہلِ ایمان سے قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ کا پہلا خطاب سُنائی دیتا ہے۔

اہلِ ایمان سے پہلا خطاب

> يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا ط وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ O مَّا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ

یُنَزَّلَ عَلَیْکُم مِّنْ خَیْرٍ مِّن رَّبِّکُمْ ط وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ
وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ O (۵)

> اے ایمان والو! راعنا نہ کہا کرو، بلکہ اُنظرنا کہو اور توجہ سے سنو، اور کافروں کے لئے تو عذابِ الیم ہے۔ یہ اہلِ کتاب یا مشرک جنہوں نے قبولِ حق سے انکار کر دیا ہے ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے خیر نازل ہو، لیکن اللہ اپنی رحمت کے لئے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے اور اللہ بڑا فضل کرنے والا ہے۔

آیت ۱۰۴ سے اُن آداب کا باب ہمارے لئے وا ہوتا ہے جن کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ادنیٰ سی گستاخی نہیں بلکہ لاپرواہی اور ادب کی ادنیٰ سی کمی کا نتیجہ حبطِ اعمال ہو سکتا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس نکتے سے خوب واقف تھے۔ وہ مجلسِ نبوت میں یوں مؤدب اور ساکت بیٹھتے جیسے بے جان مجسمے ہوں۔ یہاں قرآنِ عظیم یہودیوں کی ایک نازیبا حرکت کی نشاندہی کر رہا ہے۔ مدینہ کے یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس بابرکات میں آ کر بیٹھتے مگر برکات و سعادت کے حصول کے لئے نہیں بلکہ شرارت کے لئے۔ اُن کی ایک شرارت تو یہ تھی کہ توجہ سے بات نہ سنتے اور پھر دوسروں کی توجہ کو منتشر کرنے کے لئے کہتے۔ ''راعنا'' یعنی ہماری طرف توجہ فرمایئے اور ہماری رعایت کیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حد درجہ تحمل سے کام لیتے اور اُن کی ایسی باتوں پر کسی ناخوشگوار ردِ عمل کا اظہار نہ کرتے۔ بعض مسلمان بھی کسی نکتے کو سمجھنے کی غرض سے ''راعنا'' کہہ دیتے۔ عام مسلمانوں نے اپنی نیک نفسی اور کشادگیٔ قلب و نظر کی وجہ سے کبھی اِس بات پر توجہ نہ دی کہ ''راعنا'' کی ادائیگی میں یہودی اپنے خبثِ باطن سے کام لیتے تھے اور زبان کو دبا کر یہ لفظ ادا کرتے جس سے اِس کا تلفظ بدل کر ''راعینا'' ہو جاتا، یعنی یہ مرکب لفظ بن جاتا ''راعی'' اور ''نا'' کا مرکب اور اِس کے معانی ہو جاتے ''ہمارا چرواہا'' اس کے علاوہ عبرانی میں یہ لفظ احمق کے معنی میں بھی استعمال ہوتا تھا۔

یہودی اپنی محفلوں میں اِس بات پر مسلمانوں کا مذاق اڑاتے کہ انہوں نے ہماری

تقلید میں اپنے رسول کے لئے نازیبا اندازِ تخاطب اپنالیا ہے۔ اِس پر قرآنِ حکیم نے انہیں حکم دیا کہ وہ راعنا کو ترک کر کے ''اُنظرنا'' کہیں اور اِس حکم کی تکمیل یوں کی گئی کہ ''اسمعوا'' توجہ سے سنا کرو۔ تاکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دہرانے کی زحمت نہ ہو۔ نبی ؐکریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوئے مرتبہ کا یہ پہلو کتنا اہم ہے کہ آپ کے ذکر میں حد درجہ احتیاط مسلمانوں کے اندازِ زیست کا حصہ ہے۔ پھر یہود کی آواز اور لہجے میں بھی منصبِ نبوت کا لحاظ اور پاس داری نہ تھی۔ احترامِ نبوت کا تقاضا یہی تھا کہ آپ کی بات حد درجہ نرمی، توجہ اور شائستگی کے ساتھ سنی جائے۔ آپ کے حضور آوازیں پست رہیں۔ یہ ایک دائمی حکم ہے اور آج اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اپنے نفس کو اُس بات کے سامنے جھکادیں جس کی آپ نے تعلیم دی۔ سورۂ حجرات میں سورۂ بقرہ کے اسی حکم کو دوسرے سیاق و سباق میں نہایت ہی وضاحت کے ساتھ توسیعی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

> یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ○(٦)
>
> اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو، اور نبی ﷺ سے اونچی آواز میں بات نہ کرو، جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں (اور کیا دھرا اکارت ہو جائے) اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

قرآنِ حکیم کے اندازِ کلام کے پھیلاؤ اور بلاغت کو ملاحظہ کیجئے۔ اہلِ ایمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جان سے عزیز رکھتے تھے۔ اس بات کا ثبوت انہوں نے ان معرکوں میں دیا جب موت، زندگی کی نسبت اُن سے قریب تر تھی۔ لیکن وہ ایک ایسے معاشرے کے فرد تھے جہاں آداب، قربتِ عمل کے منافی سمجھے جاتے تھے۔ اسلام نے اس پورے منظر نامے کو بدل دیا اور محمدِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے اُن کی آزادیوں کو آداب کے سانچے میں ڈھال دیا گیا۔

نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آدب پر بعض اور پہلوؤں سے بھی غور مناسب ہوگا۔

ادبِ رسولِ کریم ﷺ کے پہلو

رحمۃ للعالمین، صاحبِ خُلقِ عظیم حضرت ابوالقاسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور آواز بلند نہ کرنے کے حکم سے پہلے یہ فرمایا گیا کہ!

> یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○ (۷)
>
> اے ایمان والو! اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے آگے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

قرآنِ حکیم نے یہ صراحت نہیں فرمائی کہ کن امور میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے سامنے آگے نہ بڑھا جائے۔ اِس سے یہ نکتہ اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ مومن کو اپنی پوری زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل کا اتباع کرنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول اور عمل اللہ کے احکام اور اشارات کے مطابق تھا اور یوں آپ کے سامنے پیش قدمی نہ کرنا اللہ کے سامنے ٹھہر جانے کے مترادف ہے۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے اہلِ ایمان کو وہ آداب اور احکام عطا کئے گئے جن کے دائرے بہت وسیع ہیں۔ اِسی حکمِ قرآن کی بنیاد پر یہ اصول اخذ کیا گیا ہے کہ علماء اہلِ علم اور استاد کا احترام بھی اِسی انداز سے کیا جائے۔

> ایک دن حضرت ابوالدرداءؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ کے آگے چل رہے ہیں تو آپ نے تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ کیا تم ایسے شخص کے آگے چلتے ہو جو دُنیا و آخرت میں تم سے بہتر ہے اور فرمایا کہ دنیا میں آفتاب کا طلوع و غروب کسی ایسے شخص پر نہیں ہوا جو انبیاء کے بعد ابوبکرؓ سے بہتر و افضل ہو۔ (۸)

اب ”لاترفعوا اصواتکم“ کی طرف پھر آیئے۔ جیسا کہ لکھا گیا کہ یہ دائمی حکم ہے جس کے تحت ہم اپنی کسی رائے یا خیال یا میلان کو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم یا

عمل پر ترجیح دے کر ''حبطِ اعمال'' کے عذاب میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اِس مفہوم کے علاوہ یہ حکم اپنے ظاہری اور لفظی پہلو کے اعتبار سے آج بھی واجبِ اتباع ہے۔ نبیٔ آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے مواجہ شریف میں آج بھی بے حد پست آواز میں. سلام پیش کرنا چاہئے۔ یہاں جُنبشِ لب کا آہنگ بھی برقرار رکھنا ایمان کی علامت ہے۔ یہی وہ مقامِ فلک رفعت ہے جس کے بارے میں کہا گیا!

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

یہاں اہلِ ایمان کو فضا میں اُڑتے ہوئے پرندوں کے اندازِ پرواز میں بھی ادب کے قرینے نظر آتے ہیں اور فضا بھی سانس روکے ہوئے دست بستہ کھڑی دکھائی دیتی ہے۔

اِسی حکم کا اطلاق اُن محفلوں پر بھی ہوتا ہے جن میں صاحبِ حکمتِ کبریٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پڑھی جا رہی ہوں۔ مجالسِ حدیث میں یوں شرکت کی جائے جیسے ہم اپنے آقا، اپنے ہادی، اپنے مولا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محفلِ بابرکات میں بیٹھے ہوں۔ زمانے کی گردشیں اِس ذوقِ حضوری اور اِس رشتے پر غالب نہ آسکی ہیں اور نہ آسکیں گی۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے آداب اِس درجہ اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ تقویٰ اور عقل کی اساس قرار دیئے گئے۔ جن کے دلوں میں تقویٰ جاگزیں ہے اور جو صاحبانِ عقل ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجۂ صبا کے لہجے میں لب کشا ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر مجلس میں رونق افروز نہ ہوتے اور حجراتِ امہات المؤمنینؓ میں سے کسی حجرے میں ہوتے تو انتظار کرتے اور انتظار کے یہ لمحے بھی انہیں ادب کا درس دیتے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ط لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ○ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (۹)

> جو لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حضور اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے جانچ لیا ہے۔ انہیں کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔ (اے نبی ﷺ) جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے آواز دیتے ہیں (اور پکارتے ہیں) ان میں سے اکثر صاحب عقل نہیں ہیں، اور اگر وہ آپ کے باہر نکلنے تک صبر کر لیتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور اللہ مغفرت اور درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔

ان آیات پر غور فرمایئے تو نبی اعظم اور ہادیٔ برحق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور بلندیٔ رتبہ کی وسعتوں کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام آدمی کے تقویٰ کا پیمانہ ہے۔ جو حضرت ختمی مرتبت کا جس قدر احترام کرے گا اُسی درجہ تقویٰ اُسے حاصل ہوگا۔ احترامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ان کے قلوب کو اللہ تعالیٰ "ادب کی تخم ریزی" کے لئے پرکھ لیتا ہے اور احترامِ رسول ﷺ کے ذریعے اِن کے قلوب کو صاف اور تقویٰ کا امانت دار بنا دیا جاتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ حجۃ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ چار چیزیں اعظم شعائر اللہ سے ہیں۔ قرآن، پیغمبر، کعبہ، نماز۔ ان کی تعظیم وہی کرے گا جس کا دل تقویٰ سے مالا مال ہو۔

وَمَنْ یُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْب (۱۰)

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جب حضور ﷺ کی آواز سے زیادہ آواز بلند کرنا خلافِ ادب ہے تو آپ ﷺ کے احکام و ارشادات سننے کے بعد ان کے خلاف آواز اُٹھانا کس درجے کا گناہ ہوگا۔ (۱۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت کردہ اصحاب تو تہذیبِ نفس، احترام و ادب، آدابِ معاشرت اور تزکیۂ قلوب کی اعلیٰ ترین مثالوں کا درجہ رکھتے تھے، لیکن جو بدوی، مختلف قبائل کے لوگ دربارِ نبوت میں مسلسل حاضری دے رہے تھے وہ ابھی تربیت نبویؐ اور اُس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے تقویٰ سے دور تھے۔

حجروں کے باہر سے آواز دینے کی مثالیں ایک سے زیادہ ہو سکتی ہیں، لیکن الحجرات

کی ان آیتوں کی شانِ نزول یہ بیان کی جاتی ہے۔

”بنی تمیم ملنے کو آئے۔ حضور ﷺ حجرۂ مبارک میں تشریف رکھتے تھے وہ لوگ باہر سے آوازیں دینے لگے کہ ”یا محمد ﷺ اُخرج الینا“ (اے محمد! باہر آیئے) یہ بے عقلی اور بے تہذیبی کی بات تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبے کو نہیں سمجھتے تھے۔ کیا معلوم اس وقت آپ پر وحی نازل ہو رہی ہو، یا کسی اور اہم کام میں مشغول ہوں۔ آپ کی ذات منبع البرکات تو مسلمانوں کے تمام دینی و دنیوی امور کا مرکز و ملجا تھی۔ کسی معمولی ذمہ دار آدمی کے لئے بھی کام کرنا سخت مشکل ہو جائے، اگر اُس کا کوئی نظام الاوقات نہ ہو۔ اور آخر پیغمبر کا ادب و احترام بھی کوئی چیز ہے۔ چاہیے تھا کہ کسی کی زبانی اندر اطلاع کراتے اور آپ ﷺ کے باہر تشریف لانے تک صبر کرتے۔ جب آپ ﷺ باہر تشریف لا کر اُن کی طرف متوجہ ہوتے اس وقت خطاب کرنا چاہئے تھا۔ ایسا کیا جاتا تو اُن کے حق میں بہتر اور قابلِ ستائش ہوتا۔ تاہم بے عقلی اور نادانستگی سے جو بات اتفاقاً سرزد ہو جائے اللہ اُس کو اپنی مہربانی سے بخشنے والا ہے۔ چاہئے کہ اپنی تقصیر پر نادم ہو کر آئندہ ایسا رویہ اختیار نہ کریں۔ حضور ﷺ کی تعظیم و محبت ہی وہ نقطہ ہے جس پر قومِ مسلم کی تمام پراگندہ قوتیں اور منتشر جذبات جمع ہو جاتے ہیں اور یہ ہی وہ ایمانی رشتہ ہے جس پر اسلامی اُخوۃ کا نظام قائم ہے۔ (۱۲)

رسالت و نبوت

قرآنِ حکیم کی ابتدائی آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر زور دیا گیا ہے اور منصبِ رسالت کے حوالے سے آپ کا مرتبہ نظروں کے سامنے لایا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے انسانوں تک اللہ کا پیغام یوں پہنچایا کہ آپ ﷺ کے ذریعے دین کی تکمیل کی گئی اور جیسا کہ آپ نے صفحاتِ گزشتہ میں ملاحظہ کیا کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت در حقیقت سلسلہ وحی و رسالت کی مخالفت تھی۔

یہ نکتہ آپ کے سامنے آچکا ہے کہ مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ کا پہلا خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے ہے۔ تین آیات کے بعد ہی اہلِ ایمان سے فرمایا گیا۔

اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَکُمْ کَمَا سُئِلَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ

الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ O (۱۳)

کیا تم (مسلمان) بھی چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے اُسی طرح سوال کرو جس طرح اِس سے پہلے موسیٰ سے سوال ہو چکے ہیں، اور جو ایمان کے بدلے کفر اختیار کرلے تو وہ سیدھی راہ سے بہک (اور بھٹک) گیا۔

رسول ہونا، حضرت محمدِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا اور بنیادی اعزاز ہے۔ اِس پر اضافہ کیجئے آخری رسول ہونے کا۔ وہ جس پر سلسلہ رسالت کو ختم کیا گیا۔

اب ذرا قرآنِ حکیم کے اندرونی اور معنوی ربط اور ارتقائے مسلسل کو نظر میں رکھئے۔ سورہَ بقرہ کی آیات ۹۷ تا ۹۹ سے یہ نکتہ سامنے آیا کہ حضرت محمدِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سلسلہَ وحی و نبوت کی مخالفت و عداوت ہے، پھر یہودیوں کا طرزِ عمل سامنے آیا (آیات ۵۔ ۱۰۴) کہ ایک "راعنا" میں اپنے خبثِ باطن کو کس طرح سمو دیا۔ اب اُسی سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے اُسی حوالے سے کہا جارہا ہے کہ کیا تم یہودیوں کی تقلید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُسی طرح سوال کرنا چاہتے ہو جیسے یہودی حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے کیا کرتے تھے یوں یہ بات اُبھر کر آگئی کہ ایمان لانے کے بعد اُمتی کا اپنے رسول سے کیا اور کیسا تعلق ہونا چاہئے۔ یہ تعلق سمع واطاعت کا تعلق ہوگا۔ یہ رشتہ غیر واقعی سوالات اور منطقی موشگافیوں کا رشتہ نہیں ہے، کیونکہ رسالت کے اقرار کے بعد ایمان لانے والا اِس بات کو تسلیم کرلیتا ہے کہ رسول، اپنی اُمت کے لئے اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اِس ایمان کے بعد اُس پیغام کو اپنانے اور اُسے راہِ حیات کے طور پر قبول کرنے کے سوا کوئی اور راستہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخ رسالت و نبوت سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اپنے بھیجنے والے کے پیغام کو اپنی اُمت کے افراد کی ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کے مطابق تسلسل اور آہستگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور تدریج کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ حضرت احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تو ساری دنیا اور آنے والے تمام زمانوں کے لئے مبعوث فرمائے گئے، اسی لئے یہ پیغام ۲۳ سال کی مدت مین تدریجاًیوں نازل کیا گیا کہ اِس کے ہر پہلو کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل کے ذریعے یوں پیش کیا کہ ہر نقطہ، ہر لفظ اور ہر حکم انسانی عمل کے دائرے میں شامل کردیا اور یوں انسانوں پر حجت قائم فرمادی۔ اِس سے منصبِ

رسالت کے ساتھ ساتھ فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ عالی کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آپؑ تو منصبِ رسالت کی عظمت و بلندی کے امین اور نشان ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے رسالت کے مفہوم کو جہاں تک ہو سکے، سمجھنا ضروری ہے، ویسے رسالت ایک ایسا مرحلۂ بلند، ایسا رتبۂ عظیم اور ایسی ذمہ داری ہے جس کا مکمل احاطہ انسان کے لئے ممکن نہیں۔ وحی الٰہی کے بوجھ کو برداشت کرنے والا قلب کن عظمتوں کا حامل ہوتا ہے۔ اس کو اللہ اور اُس کے رسولوں کے علاوہ کون جان سکتا ہے، بالخصوص آخری وحی کے سلسلے کو فرشتے کے ذریعے وصول کرنا یا راست سننا، صرف قلبِ محمدی کے لئے یہ عظمت اور یہ عظیم ذمہ داری ودیعت ہو چکی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام بیشک ہماری طرح بشر تھے اور اُن کے اور ہمارے درمیان یہی فرق تھا کہ اُن پر وحی نازل ہوتی تھی اور وحی الٰہی (قرآن) کا بوجھ تو ایسا تھا کہ پہاڑ بھی اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خٰشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ط (۱۴)

اگر یہ قرآن ہم کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تو ضرور دیکھ لیتا کہ وہ اللہ کے خوف سے دب جاتا (اور) پھٹ جاتا۔

قرآنِ حکیم کے اِن الفاظ سے اللہ کے کلام کی عظمت کا نقش بھی اُبھرتا ہے، متکلم کی جلالت بھی سامنے آتی ہے اور مخاطبِ کلام کا مرتبہ بھی۔ یہ کلام تو ایسا ہے کہ اِس کی عظمت سے پہاڑ کا جگر بھی شق ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کفار کی شقاوتِ قلبی کو دیکھئے کہ اُن کے دل اِس کلام کی ہیبت و عظمت کے سامنے بھی سپر انداز نہیں ہوتے۔

قرآن عظیم کی منزلت کے اِس ذکر کے بعد ہی ارشاد ہوا کہ!

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۱۵)

اور یہ مثالیں ہم لوگوں کو سناتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔

اِس کے بعد ہی سورۂ الحشر کی وہ دو آخری آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے کئی

اسماء الحسنیٰ ایک ساتھ آتے ہیں۔ وہ اسماء الحسنیٰ جو متکلم کی شان کے آئینہ دار ہیں اور کلام کی عظمت کا اشاریہ بھی۔

قرآنِ کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے ذکر کے سائے میں دوسرے رسول اکرم علیہم السلام کی عظمتوں کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرنے سے پہلے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''رسول'' کے دوسرے لغوی معنوں اور مفاہیم کو پیش کر دیا جائے۔ رسول کے ساتھ جو دوسرے فرائض وابستہ ہیں اور جو منصبِ رسالت کی شاخیں اور شانیں ہیں وہ بعد میں آپ کے سامنے آئیں گی۔

رسول کے بنیادی معانی میں سے ایک معنی یہ بھی ہیں. کہ کسی شئے (یا فرد) کے سامنے جو رکاوٹ ہو اُسے ہٹا دیا جائے اور اُس رکاوٹ کے ہٹنے سے وہ چیز یا فرد آہستگی اور نرمی سے چل پڑے۔ جب رسول کے سامنے سے دنیا کی حدود اور تنگیوں کو دور کر دیا جاتا ہے اور ایک نئی اور جاوداں دنیا اُس کی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے تو وہ اپنے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے اور تنذیر و تبشیر کی راہوں سے گزرتا ہوا اس سفر میں انسانیت کے قافلے کی رہنمائی کرتا ہے۔ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیتوں کے بعد وحی کا سلسلہ خاصی مدت تک رکا رہا اور اُس کے بعد سورۃ المدثر نازل ہوئی!

یَا یُّھَا الْمُدَّثِّر O قُمْ فَاَنْذِرْ O (۱۲)

> اے مدثر! اُٹھ کھڑے ہو اور (لوگوں کو) خبر دار کرو (ان کو اُن کے رب کی نافرمانی سے ڈراؤ)

مدثر کا ترجمہ عام طور پر لحاف اوڑھنے والے اور کپڑے میں اپنے کو ڈھانپ لینے والے کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وحی الٰہی کو وصول کرنے والے نہایت عظیم تجربے کے ردِعمل کے طور پر آپ ﷺ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ مجھ پر لحاف (یا کمبل) ڈال دو، لیکن دثر کے مفاہیم اور بھی ہیں اور منصبِ عظیم رسالت کے ہم ردیف ہیں، لپٹ جانے کے علاوہ الدثر کثیر مال و متاع کو کہتے ہیں۔ درخت کے نئے پتے نکلنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اپنے گھر کو آراستہ، باترتیب اور درست کے معنی میں بھی یہ لفظ آتا ہے اور کسی پر چھا جانے کے مفہوم کو بھی یہ لفظ ادا کرتا ہے۔ اب سورۃ المدثر

کی ابتدائی آیات کے معانی کو ذہن میں لایئے۔ وہ جسے رسالت کا مرتبہ عطا کیا گیا ہے اور جسے آغازِ سفر کا حکم دیا گیا، اُس سے فرمایا جارہا ہے کہ اے مدثر! اُٹھ کھڑے ہو اور لوگوں کو خبر دار کرو اور اپنے رب کی کبریائی اور بڑائی کا اعلان کرو اور اپنے کپڑے کو طاہر اور پاک رکھو اور گندگی (رُجز) سے دور رہو۔ (۱۷)

جب رسول کی طرف اللہ تعالیٰ کی وحی بھیجی جاتی ہے تو وہ ان تعلیمات کی تبلیغ ہر پہلو سے کرتا ہے۔ ایک طرف وہ اللہ کے پیغام کو اپنی قوم، اپنے علاقے یا عالمِ انسانیت تک پہنچاتا ہے اور دوسری طرف وہ وحی کے راستے پر اپنا سفر شروع کرتا ہے اور یوں کہ پیغامِ الٰہی کے ہر حکم، ہر لفظ اور ہر نقطے کو اپنے عمل کے ذریعے اُجال کر لوگوں کے سامنے عملی نمونہ پیش کرتا ہے۔ اُس کے عمل میں اس درجہ اعتدال، حُسن اور ہمہ گیری ہوتی ہے کہ تعلیماتِ الٰہی کی منفعت اور انسان کے لئے اُس کی اہمیت و حیات بخشی واضح ہو جاتی ہے۔ ہر رسول اللہ کے پیغام اور وحی کو مکمل دیانت اور امانت کے ساتھ انسانوں تک پہنچا دیتا ہے۔ وہ کسی مصلحت یا خوف کو اپنے راستے میں حائل نہیں ہونے دیتا، بلکہ حق تو یہ ہے کہ کسی مصلحت کا تصور تک اُس کے ذہن میں نہیں آتا اور خوف سے تو اللہ کے صالح بندے بھی بلند تر ہوتے ہیں۔ وہ خوف اور حزن کے احساس اور سطح سے بلند تر ہوتے ہیں، پھر رسول کے سلسلے میں تو اِس انداز سے سوچنا بھی ایمان کی نفی کرنا ہے۔ رسول کو ہر لمحہ اللہ کی رفاقت حاصل ہوتی ہے۔ اُس کا رفیق اعلیٰ اُس کے سفر میں اُس کا تحفظ فرماتا ہے اور جو رسول اس راہ میں اپنی جان سے گزر جاتے ہیں اور جنہیں اذیتیں دی جاتی ہیں یا قتل کر دیا جاتا ہے وہ اپنی مثال سے اس حقیقت کی صداقت پر گواہی دیتے ہیں کہ موت کا اندیشہ یا تجربہ بھی انہیں خوف میں مبتلا نہیں کر سکتا۔

ہر رسول اپنے راستے کا پہلا راہی ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنی رسالت پر ایمان لاتا ہے اور مسلمِ اول ہوتا ہے۔ اس کا ایمان اس درجہ مکمل ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی مکمل رفاقت میں ڈھل جاتا ہے۔ اِس رفاقت کو قرآنِ حکیم نے یوں پیش کیا ہے کہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ اللہ سے محبت کا دعویٰ کرنے والوں کے لئے یہ کسوٹی مقرر کی گئی کہ وہ رسول اللہ کا اتباع کریں۔ رسول کی اطاعت ہی دین کی اساس تھی، ہے اور رہے گی۔ اہلِ ایمان سے

یہی مطالبہ کیا گیا ہے کہ کسی اختلاف کی صورت میں وہ اللہ اور رسول کی طرف رجوع کریں۔

رسالت اور رسول کے سلسلے میں قرآنِ حکیم کی روشنی میں چند نکات اوپر پیش کئے گئے۔ اِن سے تمام رسولوں کے مرتبے اور فرائض کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تو سلسلۂ رسالت ختم ہوا۔ وہ آخری رسول ہیں اور اُن کی رسالت پر ایمان لانا قیامت تک کے لئے انسانوں پر فرض کر دیا گیا۔ پھر وہ کسی ایک قوم کی طرف نہیں بھیجے گئے۔ بلکہ تمام انسانوں کے لئے۔ وہ جو آپ کے عہد میں موجود تھے اور وہ جو قیامت تک اِس خاک داں میں آئیں گے۔

ہمارا ارادہ تھا کہ "نبوت" کا ذکر "رسالت" اور اُس کے متعلقہ پہلوؤں کے بعد کریں گے، لیکن مزید غور کے بعد یہی مناسب معلوم ہوا کہ نبوت کی وضاحت کا یہی مرحلہ ہے اور پھر اِن شاءاللہ، رسالت و نبوت کے مفاہیم کی روشنی میں مرتبۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جھلکیاں پیش کی جائیں گی۔

ہمارے تفسیری ادب میں رسالت اور نبوت کے فرق کو بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے اور منطق و فلسفہ، ادب و لغت کے حوالوں سے اِن دونوں کے درمیان لکیر کھینچی گئی ہے مگر قرآنِ حکیم کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جن رسولوں کے اسمائے گرامی کتاب اللہ میں آئے ہیں اور بار بار آئے ہیں اُن میں سے بیشتر کو اللہ تعالیٰ نے نبی اور رسول کہا ہے، یعنی وہ نبی بھی تھے اور رسول بھی، لیکن سلسلہ نبوت کے ارتقا اور مدارج کو سامنے رکھتے ہوئے رسول اور نبی کے مابین بہت ہلکے سے اور لطیف فرق کا احساس ہوتا ہے۔ ہر وہ جلیل القدر ہستی جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی سے نوازا وہ نبی ہے اور جسے نئی شریعت عطا کی گئی وہ نبی ہونے کے ساتھ ساتھ رسول بھی ہے۔ بنی اسرائیل میں بہت سے نبی بھیجے گئے۔ تواتر کے ساتھ یکے بعد دیگرے تاکہ پیغامِ ہدایت کو دہراتے رہیں۔ یہ سب رسول نہیں تھے۔ اِن انبیاء میں سے جن کو خصوصی امتیاز حاصل ہوا یعنی مکذبین کے مقابلے پر جداگانہ امت کی طرف مبعوث ہوں یا نئی کتاب اور مستقل شریعت رکھتے ہوں وہ "رسول نبی" یا "نبی رسول" کہلاتے ہیں۔ شرعیات میں جزئی تصرف مثلاً کسی عام کی تخصیص یا مطلق کی تقیید وغیرہ رسول کے ساتھ مخصوص نہیں عام انبیاء بھی کر سکتے ہیں۔ (۱۸)

قرآنِ حکیم کی بعض سورتوں میں ”رسول نبی“ یا ”نبی رسول“ کا ذکر ایک مرتبہ سے زیادہ کیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں ”سورۂ مریم“ کا ذکر بطورِ خاص مناسب ہوگا۔

سورۂ مریم میں حضرتِ ادریس علیہ السلام کا ذکر ایک آیت میں ملتا ہے!

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ○ (۱۹)

اور کتاب میں ادریس کا ذکر کر۔ وہ سچے نبی تھے۔

قرآن کریم میں صرف دو بار حضرتِ ادریس علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ ایک بار سورۂ مریم میں اور دوسری جگہ سورۂ انبیاء میں۔ سورۂ انبیاء میں اُن کا اسم گرامی حضرت اسمٰعیلؑ اور ذاالکفل کے ساتھ ملتا ہے اور انہیں ”صابرین“ میں شمار کیا گیا ہے۔ صبر کی صفت انسانوں کو انبیاء کے واسطے اور مثال سے عطا کی گئی ہے!

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ (۲۰)

اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذاالکفل۔ یہ سب ہیں صبر کرنے والے۔

مؤرخین اور تاریخِ انبیاء کے مصنفوں اور محققوں کے نزدیک حضرتِ ادریس علیہ السلام، حضرتِ نوح سے پہلے مبعوث ہوئے۔ لیکن مسلم شریف کی ایک حدیث، جس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں، کے مطابق حضرت نوحؑ، حضرت آدمؑ کے بعد پہلے رسول ہیں۔ یوں قرآنِ حکیم اور حدیث، دونوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر نبی، رسول نہیں ہوتا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

یا نوح اَنتَ اول الرُسل اِلَی اھل الاَرض (۲۱)

اے نوح! تم زمین پر سب سے پہلے رسول ہو۔

ہمارے عہد کے ایک مشہور ”اسکالر“ نے یہ کلیہ بار بار بیان کیا ہے کہ ہر رسول، نبی اور ہر نبی رسول ہوتا ہے۔ اُن کا ارشاد ہے کہ ”عام طور پر کہا جاتا ہے کہ رسول وہ ہے جو اپنے ساتھ کتاب بھی لائے اور نبی وہ ہے جو کتاب نہ لائے۔ یہ خیال قرآنِ حکیم سے بے خبری پر مبنی ہے۔“ یہ علمی تنازع ہمارا موضوع نہیں، لیکن حضرتِ ادریس کی قرآنی مثال اور مسلم شریف کی حدیث سے ہمارے اسکالر کی ”بے خبری“ آشکار ہو جاتی ہے۔ مگر مشکل یہ

ہے کہ وہ حدیث کو حجت نہیں مانتے۔

قرآنِ عظیم کے بعض مقامات اس خیال کو رد کرتے ہیں کہ نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ (۲۲)

اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے کوئی رسول اور نہ نبی۔

رسول اور نبی کے درمیان واؤ عطف دونوں کے فرق اور مغائرت کی دلیل ہے۔ اگر دونوں ایک ہی ہیں تو ولا نبی کہنے کی ضرورت نہیں رہتی، کیونکہ نبی تو رسول ہی سے ذکر میں آ گیا اب علیحدہ ذکر کی کیا حاجت۔ (۲۳)

ایک اور نکتہ بھی سامنے رہے تو بہتر ہے اور وہ یہ نبی صرف انسان ہی ہوتا ہے اور رسولوں میں فرشتے بھی شامل ہیں۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (۲۴)

اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے رسول منتخب فرمالیتا ہے۔

نبی کے مادہ کے سلسلے میں علمائے لغت میں اختلاف ہے مگر ہمارے خیال میں ان تمام مادوں میں نبی اور نبوت کا کوئی نہ کوئی پہلو موجود ہے۔ یہ بھی ایک معجزہ ہے۔

"نباء" کے معنی ہیں خبر دینا۔ اس اعتبار سے نبی وہ ہے جو خبریں دے (غیب اور مستقبل کی) بعض صاحبان نے اس مفہوم کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اُن کے نزدیک یہ تصور عہد نامہ قدیم کا تصور ہے۔ انگریزی کا لفظ Prophet بھی یہی معانی ادا کرتا ہے۔ یعنی پیش گوئی کرنے والا۔ نبی اور نبوت کو اسی حد تک محدود رکھنا یقیناً نبوت کے مرتبہ بلند کے ساتھ انصاف نہیں، لیکن یہ نبوت کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو ضرور ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی ایک دلیل وہ پیش گوئیاں ہیں جو معجزے کے دائرے میں شامل ہیں۔ ہم محض ایک پیش گوئی کو پیش کر رہے ہیں۔ بہت سی ایسی پیش گوئیاں آپ حیاتِ طیبہ اور سیرتِ مبارکہ کی کتابوں میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

ہجرت کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری کے لئے قریش مکہ نے سو اونٹنیوں کے انعام کا اعلان کیا اور کتنے ہی لوگ تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ ان لوگوں

میں سراقہ بن مالک بن جعشم بھی شامل تھا۔ اس نے ایک گھوڑے پر سوار ہو کر آپ کے نشاناتِ قدم کی مدد سے تعاقب شروع کیا۔ لیکن اس کے گھوڑے کو اچانک ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا لیکن اب بھی اس نے ہار نہ مانی اور آپ کے نشانات پر آگے بڑھتا رہا۔ دوسری مرتبہ اس کے گھوڑے نے پھر ٹھوکر کھائی اور وہ گرا۔ پھر سوار ہوا اور تعاقب شروع کیا، یہاں تک کہ یہ لوگ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ) اُس کو سامنے نظر آگئے اور اسی وقت تیسری بار گھوڑے نے سخت ٹھوکر کھائی اور اُس کے دونوں اگلے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ سراقہ گر پڑا، اس کے ساتھ بگولہ یا آندھی کی شکل میں وہاں سے دھواں بھی اُٹھا۔ عین اس حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ اس دن کی طرف جاتی ہے جس دن آپ کے غلام کسریٰ کا تاج اور قیصر کا تخت اپنے پیروں سے روندیں گے اور زمین کے خزانوں کے مالک ہوں گے۔ آپ ﷺ نے اُس گھٹاٹوپ اندھیرے میں اس درخشاں روشنی کی پیش گوئی کی اور سراقہ سے ارشاد فرمایا:

> سراقہ! اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب کسریٰ کے کنگن تم اپنے ہاتھ میں پہنو گے؟”

اور حرف بہ حرف اسی طرح ہوا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے کسریٰ کے کنگن اُس کا پٹکا اور تاج حاضر کیا گیا تو انہوں نے سراقہ کو بلایا اور اُس کو یہ پہنایا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ (۲۵)

ایسی پیش گوئیوں اور مستقبل بینی کی کتنی ہی مثالیں آپ کی حیاتِ طیبہ میں ملتی ہیں۔ غزوۂ خندق میں ایک بڑی چٹان کھدائی کے دوران آگئی۔ اُس کو صحابہؓ کرامؓ کی کدالیں راہ سے نہ ہٹا سکیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ ادا کرتے ہوئے اُس چٹان پر ضرب لگائی۔ ایک شعلہ سا بلند ہوا۔ ایک تہائی چٹان ٹوٹ گئی۔ آپ نے فرمایا ”اللہ اکبر! مجھے شام کی کنجیاں عطا کر دی گئیں۔“ آپ نے پھر ضرب لگائی، پھر شعلہ سا بلند ہوا، ایک تہائی چٹان اور ٹوٹ گئی۔ ارشاد ہوا۔ ”اللہ اکبر! مجھے فارس کی کنجیاں دیدی گئیں۔ اللہ کی سوگند، میں مدائن کا قصرِ ابیض اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔“ آپ نے باقی ماندہ چٹان پر ضرب لگائی۔ چٹان ریزہ ریزہ ہو گئی۔ پھر شعلہ بلند ہوا اور آپ نے فرمایا: ”اللہ اکبر!

مجھے یمن کی کنجیاں دے دی گئیں۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، میں شہر صنعا کے دروازے اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں" مستقبل کی اسلامی فتوحات اُس وقت آپ کو دکھادی گئیں، جب دشمن کی مشترکہ فوجوں سے بچاؤ کے لئے مدینہ کے گرد خندق کھودی جارہی تھی۔ یہ پیش گوئی بھی سراقہ سے کیے گئے وعدے کی توثیق تھی۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ہم مستقبل بینیٔ نبی اکرم ﷺ کی صرف ایک مثال پیش کریں گے ورنہ ایسی مثالوں کی کمی نہیں۔ "حدیث جبرئیل" میں بلند عمارات کی تعمیر کا ذکر، "باب الفتن" میں اُن فتنوں کی نشان دہی جو ہمارے دور میں حقیقت بن کر سامنے آرہے ہیں۔

بعض اربابِ لغت نبی کا مادہ "ن ب و" قرار دیتے ہیں۔ نبو اور نبوۃ کے معانی ہیں بلند ہونا، بلندی حاصل کرنا۔ بلند جگہ کو النبیُ کہتے ہیں۔ کسی بلندی پر نصب وہ نشان بھی نبی ہے جو رہنمائی اور سمت نمائی کے لئے لگایا جائے۔

اِس مفہوم کو سامنے رکھئے تو نبی وہ ذات ہے جو کسی بلند مقام پر کھڑا ہو اور لوگوں کی رہنمائی کر رہا ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے عام اعلان سے یہ معانی واضح ہو کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے تین سال تک اپنے قریبی حلقے، اعزا، دوستوں اور دوستوں کے متعلقین میں اسلام کی تبلیغ فرمائی اور پھر آپ کو آپ کے رب نے حکم دیا!

> فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (۲۶)
>
> اور تم کو جو حکم ہوا ہے وہ کھول کر (صاف صاف) سنادو اور مشرکوں کی پروانہ کرو۔

اس حکم کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا کی چوٹی پر چڑھے اور بلند آواز میں یہ صدا لگائی یا صباحاہ۔ یہ نعرہ عربوں کے لئے جانا پہچانا تھا اور اُس وقت لگایا جاتا تھا جب کسی دشمن یا غنیم کے حملے کا فوری خطرہ ہوتا۔ یا صباحاہ کا نعرہ سننا تھا کہ قریش کا سارا قبیلہ وہاں جمع ہو گیا۔ اُس وقت آپ اُن سے مخاطب ہوئے اور ارشاد فرمایا!

> اے بنی عبد المطلب! اے بنی فہر! اے بنی کعب! اگر میں تم کو یہ اطلاع دوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک لشکر کھڑا ہے اور تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے، تو کیا تم اِس بات پر یقین کر لو گے؟

عرب حقیقت پسند اور عملی لوگ ہیں۔ انہوں نے اس شخص میں سچائی، امانت و دیانت اور خیر خواہی کا بارہا تجربہ کیا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہ شخص پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہے اور پہاڑ کی دوسری طرف بھی اُس کی نظر ہے۔ تو اُن کی ذہانت، انصاف پسندی اور اس امین و صادق مخبر کی اطلاع و خبر نے اُن کی رہنمائی کی اور اُن سب نے کہا کہ ہاں ہم یقین کرلیں گے۔

جب یہ فطری اور ابتدائی مرحلہ طے ہوا اور سننے والوں کے اعتماد و یقین کا علم ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا!

فَاِنِّی نَذِیْرٌ لَّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ ○

تو یہ سمجھو کہ میں تم کو ایک سخت عذاب سے ڈرانے اور آگاہ کرنے آیا ہوں جو بالکل تمہارے ہاتھوں کے سامنے ہے۔

یہ دراصل منصبِ نبوت کی صحیح تعریف اور نشان دہی تھی۔

یہ سنتے ہی مجمع پر ایک خاموشی چھا گئی، لیکن ابولہب نے کہا! تمہارا سارا دن برباد ہو، کیا صرف یہی کہنے کے لئے تم نے ہمیں بلایا تھا۔ (۲۷)

نبوت کے تمام پہلوؤں، اطراف و جوانب اور عظمت کا ایسا مظاہرہ انسانی تاریخ نے اِس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، اور یہ مثال، یہ تمثیل پہلی اور آخری بار پیش کی جارہی تھی، کیونکہ سلسلۂ نبوت پر تکمیل کی مہر کا دوسرا نام محمد تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا کی بلندی پر کھڑے ہیں۔ اُن کے سامنے اُن کی قوم کے لوگ جمع ہیں اور آپ ﷺ کی پشت پر جو کچھ ہے اُسے صرف آپ دیکھ سکتے ہیں اور وہ دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہے۔ سامنے عالمِ شہادت ہے اور پیچھے عالمِ غیب، سامنے دنیا ہے اور پیچھے آخرت اِس دنیا اور اِس کی زندگی کا نتیجہ۔ اور بلندی پر جو ذات جلوہ آرا ہے وہ جس کی نگاہوں کے سامنے جہانِ غیب و شہود کو اُن کے خالق نے اِس صاحبِ مقامِ بلند کے لئے کتاب کے اوراق کی طرح کھول دیا ہے۔ یہ ابتدائے سفر نبوت کی بات تھی اور اس کے مکی دور کے اختتام پر ہی وہ مرحلہ آیا جب معراج میں جنت اور دوزخ اور تمام زمانے آپ کے سامنے پیش کر دیئے گئے اور اپنے جد اور اُن جلیل القدر انبیاءؑ سے آپ کی ملاقات ہوئی جو آپ کے بھائی تھے۔ یہ

معراجِ نبوت و رسالت ہی نہ تھی، معراجِ آدمیت بھی تھی۔ محمدِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واسطے اور وسیلے سے انسان کو اپنے امکانات کی خبر ملی۔

امکان مرے تیری نبوت کی گواہی
تو مطلعِ امکانِ بشر، سید عالم

نبی کی شخصیت کے جو پہلو سب سے پہلے ہمارے ذہن میں آتے ہیں وہ تبشیر وتنذیر ہیں۔ نبی بشیر و مبشر بھی ہوتا ہے اور نذیر و منذر بھی، وہ اپنی قوم پر شاہد بھی ہوتا ہے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تو ساری انسانیت پر شاہد ہیں۔ یہ نکتہ بھی پیش کیا جا چکا ہے کہ وہ نبوت کے تسلسل کی تکمیل ہیں اور اقبال کے الفاظ میں تمام رسول اُن کے وجود اور نبوت کے تدریجی مراحل تھے۔

All Prophets were mohammad in making.

یہ سب نکات اس مطالعے میں اپنے اپنے مقام پر آئیں گے۔ اس وقت تبشیر و تنذیر پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم قرآنِ عظیم کے ان چند مقامات کو پیش کرنا چاہتے ہیں جن میں آپ کی رسالت و نبوت اور ان کے فرائض کا ذکر ہے۔ یہ مراتب و فرائض سارے ہی نبیوں اور رسولوں میں مشترک ہیں، لیکن ان کی تکمیلی صورت حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نظر آتی ہے۔

تمام انبیائے کرامؑ کی دعوت کے تین بنیادی نکتے یہ ہیں کہ وہ انسانوں کو بتاتے ہیں کہ انفرادی زندگی اور اجتماعی معاشرے کا مقتدرِ اعلیٰ اِس کائنات کا خالق ہے، دوسرا نکتہ یہ ہے کہ رسول، مقتدرِ اعلیٰ کا نمائندہ ہوتا ہے، اسی لئے اُس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہوتی ہے، اور تیسرا نکتہ یہ ہے قانون کا سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ دنیا کے اور معاشروں میں اپنی تنظیم کے بعد معاشرہ اپنی زندگی کو آسان اور محفوظ بنانے کے لئے قانون سازی کرتا ہے، لیکن انبیائے کرامؑ قانونِ الٰہی لے کر آتے ہیں. اور اُس کے مطابق معاشرے کی شیرازہ بندی کرتے ہیں۔ انسان کے بنائے ہوئے قانون کے سلسلے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ طاقت ور اور ترجیح یافتہ طبقہ یا طبقات قانون وضع کرتے ہیں اور اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ اِن دنوں آپ ہر وقت خواتین کو برقیاتی ذرائع ابلاغ اور اخبارات و رسائل میں اسی نعرے کو

دہراتے ہوئے پاتے ہیں کہ ہم مردوں کی دنیا میں رہنے پر مجبور ہیں اور ہم ان کے چنگل میں گرفتار ہیں۔ اللہ کا قانون کسی طبقے یا صنف کی جانب داری نہیں کرتا بلکہ ہر طبقے کے حقوق کی مکمل ضمانت دیتا ہے۔ یہ تینوں نکات حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی قرآنِ حکیم میں پیش کئے گئے ہیں، مگر انہیں تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا اعلان سمجھئے!

وَجِئۡتُكُم بِاٰيَةٍ مِّن رَّبِّكُمۡ ﵚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُونِ ○ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّی
وَرَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ ○ (۲۸)

اور میں نشانی لے کر تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو (اللہ سے ڈرو) اور میری اطاعت کرو۔ بیشک اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، پس اُسی کی عبادت اور بندگی اختیار کرو۔ یہی صراطِ مستقیم (اور سیدھا راستہ) ہے۔

رسول کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے۔ رسالت کا مقصد ہی انسانیت کے رخ کو اللہ کی اطاعت کی طرف موڑنا اور طاغوت سے نجات دلانا ہے، اسی لئے ہر قوم اور انسانی جماعت کی طرف تاریخ کے مختلف ادوار میں رسول بھیجے گئے، یہاں تک کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پوری انسانیت کے لئے اور ہر دور کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے، اُن کے ذریعے دین اور اللہ کے پیغام کی تکمیل فرما دی گئی اور انسانیت کو کسی نئے پیغام یا نبی کی ضرورت نہیں رہی۔

تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا وہ لاکھوں کا سہی
اب سے تا حشر جو فردا ہے وہ تنہا تیرا

وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِی كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُولاً اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (۲۹)

ہم نے ہر اُمت میں رسول بھیجا (اور اُس کے ذریعے اُس قوم والوں کو خبردار کیا کہ) اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی اطاعت سے بچے رہو۔

مولانا محمود حسن صاحب کا ترجمہ قرآنِ کریم دراصل حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ کی شکلِ جدید ہے۔ انہوں نے طاغوت کا ترجمہ ''ہڑدنگے'' کیا ہے اور حضرت شاہ

صاحب نے ہڑدنگے کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ”ہڑدنگا وہ جو ناحق سرداری کا دعویٰ کرے۔ کچھ سند نہ رکھے۔ ایسے کو طاغوت کہتے ہیں۔ بت، شیطان اور زبردست ظالم سب اس میں داخل ہیں۔“ (۳۰) اب اردو میں ہڑدنگے کا لفظ طاغوت کے معانی میں استعمال نہیں ہوتا۔ اب بے سلیقگی، اچھل کود کو ہڑدنگاپن کہتے ہیں، بالخصوص یہ لفظ لڑکیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، مگر اس لفظ میں طاغوت کا بنیادی مفہوم موجود تھا، یعنی اپنی حد سے نکل جانا۔ جب کوئی فرعون، اور کوئی نافرمان قولاً یا عملاً اپنی حدود سے نکل کر خدائی کا دعویٰ کرے تو وہ اپنی حد سے نکل جاتا ہے۔ یہ وہ ہیں جو بندگی کی حدود کو توڑ دیتے ہیں۔ ان کی کم ظرفی اقتدار، دولت اور طاقت کی طغیانیوں کی نذر ہو جاتی ہے۔ ان طاغیوں (طاغوت میں مبتلا) کی آج ہمارے معاشرے میں کمی نہیں۔ یہ وہ ہیں جو اللہ کے مقابل اپنی اور اپنے قانون کی اطاعت چاہتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو ”حدود اللہ“ کو ظلم اور فرسودہ قرار دیتے ہیں۔ (معاذ اللہ) ہر باطل معبود، ہر باطل نظم، ہر حدود شکن آدمی، ہر بت، اور بتوں کی اطاعت کی طرف بلانے والے۔ یہ سب طاغوت کی حدود میں آجاتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے بہت سے مواقع پر اللہ کے مقابل طاغوت کا لفظ استعمال کیا ہے۔

انبیائے کرامؑ کے علم کا منبع اور مصدر اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ انبیاءؑ کسی انسان کے شاگرد نہیں ہوتے، وہ تلامیذ الرحمٰن ہوتے ہیں۔ بدنصیبی سے الشعراُ تلامیذ الرحمٰن کا محاورہ ہمارے ہاں یوں استعمال ہوتا ہے کہ اُس سے نبوت کی عظمت کو مجروح کیا جاتا ہے، جب کہ صرف یہ کہنا مقصود ہوتا ہے کہ شاعری ایک وہبی چیز ہے اور شاعر پیدائشی ہوتا ہے۔ دوسری طرف انبیاءؑ کے ذریعے انسانیت کو دائمی اور ہمیشہ قائم رہنے والی اقدار عطا کی جاتی ہیں، وحی الٰہی کے ذریعے انبیاءؑ دنیائے علم کو وہ حقائق عطا کرتے ہیں، جن تک انسان سینکڑوں بلکہ ہزاروں برسوں تک نہیں پہنچ پاتا ہے۔ انسانیت کتنے ہی خساروں کا سودا کر کے سیکڑوں برس کی مدت میں ”مساوات اور یکساں حقوق انسانی“ کی منزل تک آئی ہے اور آج بھی امریکہ جیسا ”ترقی یافتہ“ ”اعلیٰ تعلیم یافتہ“، ”علم و خرد سے مالامال“ ملک رنگ و نسل کی تفریق سے عملی طور پر نجات نہیں پاسکا ہے۔ غلامی کا خاتمہ آئینی طور پر ۱۸۶۳ء میں ہوا، لیکن سیاہ فام تکریم آدم سے محروم رہے۔ غلامی کے خاتمے کے سو سال کے بعد تک انسانی حقوق اور

سماجی مساوات سیاہ فام امریکیوں کا مقدر نہ بن سکی، شہری حقوق کی قانون سازی اس صدی کے چھٹے عشرے میں ممکن ہو سکی، اور اس کے لئے مارٹن لوتھر کنگ کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔ ایک خواب اُس کی آنکھوں میں بسا ہوا تھا۔ I Have a dream اور آج بھی کوئی دیانت دار امریکی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مساوات کا یہ خواب حقیقت کے پیکر میں ڈھل چکا ہے۔

آج سے پچیس / تیس سال پہلے تک امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں سیاہ فام امریکی شہری، سفید فاموں کے ساتھ ایک بس میں سفر نہیں کر سکتے تھے۔ انتہا یہ کہ سفید فاموں اور سیاہ فاموں کے لئے الگ الگ لانڈریاں ہوتی تھیں، اور کبھی کبھی تو ایک ہی عمارت میں۔ اب یہ صورت حال بدل گئی ہے۔ مگر انسانی رویوں اور معاشرتی برتاؤ میں باقی ہے۔ جون ۹۶ء میں سیاہ فام باشندوں کے کتنے کلیسا جلا دیئے گئے، ''خدا کا گھر'' بھی نسلی امتیاز کا صید زبوں ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ برسوں میں تیس سیاہ فام چرچ جلائے جا چکے ہیں، اور جن کلیساؤں پر حملے کئے گئے ان کی تعداد اسی سے زیادہ ہے۔ (۳۱) افریقہ تو چند سال پہلے تک نسلی امتیاز کی پالیسی پر گامزن تھا، اور اپنے اس ''فلسفے'' کی ''حرمت'' کی خاطر اُس نے کھیلوں اور کئی دوسری انسانی سرگرمیوں میں عالمی سطح پر علیحدگی کو بھی قبول کر لیا تھا۔ نازی جرمنی، نسلی برتری کی علامت تھا اور اسرائیل کی نام نہاد ریاست اور بیشتر یہودی آج بھی اپنے آپ کو برگزیدہ اور اللہ کے منتخب افراد قرار دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ زبانوں کی صورتِ حال کو سامنے رکھئے۔ لسانی برتری کے زعم نے کئی ملکوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ حال ہی میں کینیڈا اس خطرے کو ٹالنے میں کامیاب ہوا ہے۔ مگر کب تک کے لئے؟ کون کیا کہہ سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین اور دانائے سبل صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اس اختلافِ نسل و زبان کی حقیقی نوعیت سے انسانوں کو باخبر کیا کہ ''تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف اللہ کی نشانیوں'' میں سے ہے۔ یہ بات سورۂ الروم کی بائیسویں آیت میں ارشاد فرمائی گئی ہے، لیکن اس سے پہلے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور ہم جنس بیویوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان آیات کے بیان کا آغاز خود انسان کی پیدائش سے ہوا ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَکُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ○ وَمَنْ آیٰتِہٖٓ

اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ
رَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝ (۲۲)

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اُس نے تم کو مٹی سے تخلیق فرمایا اور پھر اب تم زمین میں (ہر طرف) پھیلے ہوئے انسان ہو۔ اور اُس کی آیات میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے واسطے تمہاری ہی قسم (اور نفس) سے جوڑے بنا دیئے تا کہ تم اُن کے پاس (سکون اور) چین سے رہو اور اللہ نے تمہارے درمیان مودت ورحمت (پیار اور مہربانی) پیدا کی۔ بیشک اِس میں فکر کرنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف اُس کی نشانیوں میں سے ہیں۔ بیشک اس میں جاننے والوں اور علم رکھنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

چند بے جان مادوں کی یک جائی سے انسان اور اُس کی ہم جنس کی تخلیق، کرۂ ارض پر اُن کا پھیل جانا اور اُن کے درمیان محبت و مودت کا سلسلہ یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں۔ اور یہ انسانی زبانیں اِسی سلسلۂ محبت کو تفکر، اپنے تجربوں کو آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے اور تمام انسانی کمالات کے حصول کا وسیلہ ہیں۔ پھر رنگوں کی وہ بوقلمونی جو جمالیات کی ایک دنیا اپنے دامن میں رکھتی ہے۔ یہ سب تو کثرت میں وحدتِ انسانی کے جلوے ہیں۔ اِسی حقیقت کو ہادیٔ نوعِ بشر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ حجۃ الوداع میں کس قوت سے پیش کیا کہ رنگ و نسل اور جغرافیائی تمیز کے سارے بت پاش پاش ہوگئے، وحدتِ آدم کی حقیقت آیت کبریٰ بن کر چمک اُٹھی۔

”اے انسانو! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے“اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا فرمایا ہے اور تعارف کے لئے شعوب و قبائل پیدا کر دیئے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ صاحبِ عزت وہ ہے جو تم میں زیادہ متقی ہو، عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے (تقویٰ ہی

باعث فضیلت ہے)، انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے۔ (۳۳)

یہ انسان کی تکریم و کرامت اور اس کی فضیلت کی دستاویز ہے اور تکریمِ آدم کا عظیم منشور قرآنِ عظیم کے یہ چار الفاظ ہیں!

وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ آدَمَ۔ (۳۴)

اسلام نے انسان کو آدم کے حوالے سے مساوات، کرامت اور سربلندی کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا اور انسان وحی الٰہی سے منہ موڑ کر اپنی عقل کے ذریعے اب کہیں جا کر ''بین الاقوامیت'' کی منزل تک پہنچا ہے۔ ''آفاقیت'' اور ''وحدتِ آدم'' کی منزل بہت دور ہے اور اُس تک صرف وحیٔ الٰہی اور اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے ذریعے ہی پہنچا جا سکتا ہے۔

مکہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیتِ آدم؟

یہ چند باتیں اس حقیقت کے بیان کے سلسلے میں عرض کی گئی ہیں کہ انبیائے کرام تلامیذ الرحمٰن ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے علاوہ وہ علم کے حصول کے سلسلے میں کسی اور کے مرہون منت نہیں ہوتے۔

نبوت و رسالت، قرآنِ حکیم کے بنیادی اور مرکزی موضوعات میں سے ایک ہے کیونکہ رسول ہی اللہ اور انسانوں کے درمیان وسیلہ اور رابطہ ہوتا ہے۔ حضرتِ آدم علیہ السلام سے حضرتِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا دین اور دعوت ایک ہی تھی۔ جزوی فرق وقت اور مکان کے مطابق تھا، یہاں تک کہ اللہ کا دین مکمل ہو گیا۔ تمام انبیائے کرام کا طریقۂ دعوت بھی یکساں تھا۔ وہ وحی الٰہی کو ماننے والوں کو مطمئن اور کامیاب زندگی اور قیامت کے بعد ابدی زندگی میں جنت کی بشارت دیتے، نافرمانوں کو اس دنیا میں خسران و نامرادی اور آخرت کے بعد جہنم کے عذاب سے ڈراتے۔ انبیائے کرامؑ اپنی ہی قوم کی طرف مبعوث کئے جاتے اور اپنی ہی زبان میں اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے۔ اُن تمام انبیاء پر اُن کی قوم والوں نے ایک سے اعتراض کئے۔ یہ کیسے رسول ہیں جو کھاتے پیتے ہیں، بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں، ان کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں ہمرکاب نہیں۔

اِن رسولوں کو ان کی قوموں نے ساحر، مسحور اور شاعر کہا۔ بات یہ ہے کہ وہ رسول اور رسالت کی نوعیت کو سمجھنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اُن کے لئے تو شعبدہ گروں، جادوگروں اور کاہنوں میں بڑی جاذبیت تھی۔ اِسی کے ساتھ ساتھ ان میں سرکشی تھی۔ یہ انبیاء کا مذاق اڑاتے ہوئے اُن سے عذاب کا مطالبہ کرتے اور جب آسمانوں سے عذاب نازل کیا جاتا، یاان کے قدموں کے نیچے زمین لرزلرزا ٹھتی یاایک آواز، ایک صاعقہ، ایک چنگھاڑ انہیں افسانہ اور قصۂ ماضی بنادیتی تو وہ آنے والوں کے لئے عبرت کا نشان بن جاتے اور اُن کی معذب بستیاں آج تک نگاہِ عبرت رکھنے والوں کے لئے نشانِ راہ ہیں۔

انبیائے کرامؑ کے دل انسانیت کے درد کا خزینہ ہوتے تھے، کافروں کی ہدایت طلبی میں اُن کی راتیں گریہ وزاری کرنے میں گزر جاتیں، ان کو جو دکھ پہنچاتے انبیائے کرامؑ اُن کے لئے سعادت اور ایمان کی دعائیں کرتے، سلسلۂ رسل سلسلۂ ذہب ہے یا عظیم ترین انسانی موتیوں کا جاوداں ہار۔ نبوت ورسالت کے مختلف پہلو آنے والے صفحات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے پیش کئے جائیں گے۔ انشاء اللہ یہ تمام پہلو موجوں کی طرح ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں، اِس لئے اِن کے ذکر میں بیان کی وہ ترتیب نہیں. ہوگی جو ہم ادنیٰ لکھنے والے عام طور پر قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید یہ بات ہم نے کہیں. عرض کی ہے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور مرتبہ کے بیان میں قرآنِ حکیم کی ترتیب کا اتباع کریں گے۔ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ آپ کی صفات کی تکرار ہمیں البقرہ سے قرآنِ حکیم کے آخر تک ملتی ہے اور سیاق و سباق کے بدلنے سے یہ تکرار نئے نئے پہلوؤں. اور مطالب کو سمیٹ کر ایک جہانِ نو کی تخلیق کرتی ہے۔ (جاری ہے)

❁

حواشی و حوالہ جات

۱۔ سورۂ بقرہ آیت ۲،

۲۔ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ادارۃ المعارف کراچی، ۱۹۷۶ء، ج ۱/ ص ۱۰۴،

۳۔ سورۂ بقرہ آیت ۹۷ تا ۹۹،

۴۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۰۱،

۵۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۰۴۔۱۰۵،

۶۔ سورۂ حجرات، آیت ۲،

۷۔ سورۂ حجرات آیت ۱،

۸۔ معارف القرآن، ج ۸/ ص ۱۰۰،

۹۔ سورۂ حجرات آیت ۳ تا ۵،

۱۰۔ سورۂ حج، آیت ۳۲،

۱۱۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، تفسیر عثمانی، دارالاشاعت کراچی، طبع جدید ۹۳ء، ج ۲/ ص ۵۸۶

۱۲۔ بحوالہ بالا،

۱۳۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۰۸،

۱۴۔ سورۂ حشر آیت ۲۱،

۱۵۔ ایضاً،

۱۶۔ سورۂ مدثر، آیت ۱۔۲،

۱۷۔ ان آیات کی تفسیر اور تفصیل سورۂ مدثر کے سلسلے میں آئے گی، انشاءاللہ،

۱۸۔ تفسیر عثمانی، ج ۲/ ص ۶۸،

۱۹۔ سورۂ مریم آیت ۵۶،

۲۰۔ سورۂ انبیاء، آیت ۸۵،

۲۱۔ ترمذی، السنن، کتاب صفت القیامۃ، باب ماجاء فی الشفاعۃ، رقم ۲۴۴۲،

۲۲۔ سورۂ حج آیت ۵۲،

۲۳۔ مولانا محمد عبدالرشید نعمانی، لغات القرآن، دینی کتب خانہ لاہور، ج ۳/ ص ۲۷، رسول اور نبی کی مفصل بحث اس جلد میں ص ۱۷ سے ۸۲ تک موجود ہے۔

۲۴۔ سورہ حج آیت ۷۵،

۲۵۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، نبی رحمت، طبع اول ۱۹۷۸ء کراچی، حصہ اول، ص ۱۶۸، ۱۷۱،

۲۶۔ سورۂ حجر، آیت ۹۴،

۲۷۔ نبی رحمت، ص ۱۲۱۔ ۱۲۲،

۲۸۔ سورۂ آل عمران، آیت ۵۰، ۵۱،

۲۹۔ سورۂ نحل آیت ۲۹،

۳۰۔ تفسیر عثمانی، ج ۱/ ص ۷۵۷،

۳۱۔ The Burning of black churches in United States by Eric Harrison (Published in Dawn, Karachi on June 17, 1996, P.13)

۳۲۔ سورہ روم آیت ۲۰ تا ۲۲،

۳۳۔ تھوڑے فرق سے یہ الفاظ اہم کتب حدیث میں ذکر ہوئے ہیں، دیکھئے، بخاری، طبع دہلی ج ۱/ ص ۲۳۴، مسلم، نور محمد کتب خانہ کراچی، ج ۱/ ص ۳۹۴، ابوداؤد، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، ج ۱/ ص ۲۶۲، ابن ماجہ نور محمد، کراچی ص ۱۹۴،

۳۴۔ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۰،